نہ کہ اصل بیاض سے۔ اس کے علاوہ مہر مرحوم نے مندرجہ ذیل تصرفات بھی کیے ہیں جو بغیر حوالے کے ہیں۔

رسالہ اُردو	حُسنِ خیال	غالب از مہر
بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں	بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں	بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زیاں
گورے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر	۔۔۔ ایضاً ۔۔۔	۔۔۔ نہ ان کے کر نظر
اب تو مل جائے گی ان سے تیری سانٹھ	۔۔۔ تیری ان سے سانٹھ ۔۔۔	۔۔۔ ان سے تیری سانٹھ
ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں	۔۔۔ ایضاً ۔۔۔	۔۔۔ اڑا دیں گے کہیں

جناب عرشی مرحوم نے، مہر مرحوم کی پیروی کرتے ہوئے "بس کہ تیرے حق میں کہتی ہے زباں" کی جگہ "بس کہ تیرے حق میں رکھتی ہے زباں" لکھا ہے۔ میرے خیال میں چونکہ زاہد سہارنپوری مرحوم نے مثنوی اصل بیاض سے نقل کر کے صفدر مرزا پوری کو بھیجی تھی جو سب سے آخر میں صفدر مرزا پوری کی زیرِ نگرانی ان کی مؤلفہ کتاب 'حُسنِ خیال' میں چھپی، اس لیے تمام متنوں پر 'حُسنِ خیال' ہی کے متن کو ترجیح دینی چاہیے۔ میں نے دیوانِ غالب (کامل) میں اسی متن کو جائز رکھا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ دونوں متنوں میں سے اچھا کون سا لگتا ہے تو اس کا حق ہمیں نہیں پہنچتا۔ مثنوی بچپن میں کہی گئی تھی اس لیے اس میں کھوٹا کھرا چھانٹنا عبث ہے۔

عُمدۂ منتخبہ میں ذکرِ غالب

تذکرۂ شعرائے موسوم بہ عمدۂ منتخبہ از اعظم الدولہ میر محمد خاں سرور، غالب کی ابتدائی شاعری کا عہد متعین کرنے کے لیے اہم ترین ماخذ ہے خصوصاً نسخۂ مملوکہ قومی عجائب گھر، کراچی۔ اس کا زمانۂ تصنیف ۱۲۱۵ھ، (۱۸۰۰-۱ء) تا ۱۲۴۷ھ، (۱۸۳۱-۳۲ء) ہے جس میں متن کے علاوہ حاشیوں پر اضافے بھی شامل ہیں۔ متن میں غالب کا ترجمہ اسد کے تحت ہے اور وہ یہ ہے:

اسد تخلص، میرزا نوشہ۔ اصلش از سمرقند، مولدش مستقر الخلافہ اکبر آباد۔ جوانِ قابل و یار باش۔ ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بردہ۔ ذوقِ ریختہ گوئی درخاطرِ متمکن۔ اکثر اشعارش در زمینِ سنگلاخ بہ مضامینِ موزوں گشتہ۔ رویۂ خیال بندی بیش از بیش پیشِ نہادِ خاطر دارد، از نتائجِ طبعِ اوست

---

۱ تفصیل کے لیے دیکھیے جائزہ مخطوطاتِ اُردو۔ جلد اوّل، ص ۱۰۴۵ تا ۱۰۵۸ از مشفق خواجہ مطبوعہ فروری ۱۹۷۹ء مرکزی اُردو بورڈ لاہور

۱۔ شمشیرِ صافِ یار جو زہراب دادہ ہو
وہ خطِ سبز ہو کہ بہ رخسارِ سادہ ہو

۲۔ دیکھتا ہوں اسے، تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

۳۔ آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیانِ اشک
لایا ہے لعلِ بیش بہا، کاروانِ اشک

۴۔ آنسو کہوں کہ آہ، سوارِ ہوا کہوں
ایسا عناں گسیختہ آیا کہ کیا کہوں

۵ ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگِ زرد ہے چمنِ زعفراں مجھے

۶۔ دیکھ وہ برقِ تبسم، بس کہ دل بیتاب ہے
دیدۂ گریاں مرا، فوارۂ سیماب ہے

۷۔ کھول کر دروازۂ میخانہ بولا مے فروش
اب شکستِ توبہ مے خواروں کو فتح الباب ہے

۸ مجلسِ شعلہ عذاراں میں جو آ جاتا ہوں
شمع ساں میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں

۹۔ ہو وے ہے جادۂ رہ، رشتۂ گوہر ہر گام
جس گزرگاہ سے میں آبلہ پا جاتا ہوں

۱۰۔ سرگراں مجھ سے سبک رو کئے نہ رہنے سے رہو
کہ بہ یک جنبشِ لب مثلِ صدا جاتا ہوں

اس نسخے کی کتابت کی تکمیل ۲۶ رمضان ۱۲۳۵ھ مطابق ۷ جولائی ۱۸۲۰ء کو ہوئی، گویا اس سے پہلے غالب کا ترجمہ لکھا جا چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب یہ ترجمہ تحریر ہوا تھا

اس وقت تک سرور، غالب سے ذاتی طور پر واقف نہ تھے گویا غالب دلّی میں ابھی نئے ہوں گے۔ وہ ۱۳-۱۸۱۲ء میں آگرہ سے دلّی آ کر مستقل طور پر سکونت پذیر ہوئے تھے۔ سال دو سال اِدھر اُدھر علمی ادبی حلقوں میں جان پہچان میں لگ گئے ہوں گے اور اس طرح شاید ۱۸۱۴ء کے آخر میں اس نسخے کی زینت بنے ہوں گے۔ چنانچہ اوپر کے ان دس اشعار کو ۱۸۱۲ء تک کے فکر کردہ اشعار کہا جا سکتا ہے جب کہ غالب کی عمر ۱۵ سال کی تھی۔

یہ دس اشعار سات غزلوں سے لیے گئے ہیں۔ پانچ غزلوں سے ایک ایک شعر، ایک غزل سے دو شعر اور ایک غزل سے تین شعر۔ پانچ غزلوں میں سے، جن کا صرف ایک ایک شعر ہم تک عمدۂ منتخبہ کے ذریعے سے پہنچا تھا، دو غزلیں مکمل دستیاب ہو گئی ہیں۔ دونوں غزلیں نسخۂ بخطِ غالب (رخ) ۱۸۱۶ء، نسخۂ بھوپال (حمیدیہ۔ق) ۱۸۲۱ء اور نسخۂ شیرانی (فا) ۱۸۲۶ء میں موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے کچھ اشعار بعد میں فکر کیے گئے ہوں تاہم ان کی اساس ۱۸۱۲ء تک پڑ چکی تھی اس لیے غزلوں کی تخلیق کا عہد یہی مانا جائے گا۔ ترمیم و تنسیخ کا عمل فن کار کے یہاں عمر بھر جاری رہ سکتا ہے۔ دونوں غزلوں کے باقی ماندہ اشعار ملاحظہ کیجیے۔ ایک غزل کے مقطع میں غالب تخلص آیا ہے۔ تب تخلص اسد ہی تھا۔ غالب تخلص کا استعمال ۱۸۱۶ء میں شروع ہوا ؎

ظاہر کرے ہے جنبشِ مژگاں سے مدعا
طفلانہ ہاتھ کا ہے اشارہ، زبانِ اشک

میں وادیِ طلب میں ہوا جملہ تن عرق
از بس کہ صرفِ قطرہ زنی تھا بسانِ اشک

رونے نے طاقت اتنی نہ چھوڑی کہ ایک بار
مژگان کو دوں فشار، پئے امتحانِ اشک

دل خستگاں کو ہے طربِ صد چمن بہار
باغِ بخوں تپیدن و آبِ روانِ اشک

سیل بنائے ہستیِ شبنم ہے آفتاب
چھوڑے نہ چشم میں تپشِ دل نشانِ اشک

ہنگامِ انتظارِ قدومِ بتاں، اسدؔ
ہے بر سرِ مژہ نگراں، دیدبانِ اشک

عہدے سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا   گر ایک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں
حلقے ہیں چشم ہائے کشادہ بسوئے دل   ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں
میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش   تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں
ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ   ہے ہے! خدا نہ کردہ، تجھے بے وفا کہوں
اقبالِ کلفتِ دل بہ مدعا رسا   اختر کو داغِ سایۂ بالِ ہما کہوں
مضمونِ وصل ہاتھ نہ آیا، مگر اُسے   اب طائرِ پریدۂ رنگِ حنا کہوں
دزدیدنِ دلِ ستم آمادہ ہے محال   مژگاں کہوں کہ جوہرِ تیغِ قضا کہوں
طرز آفرینِ نکتہ سرائیِ طبع ہے   آئینۂ خیال کو طوطی نما کہوں
غالبؔ ہے رتبۂ فہم تصوّر سے کچھ پرے   ہے عجزِ بندگی کہ علی کو خدا کہوں

جیسا کہ کہا جا چکا ہے،، جولائی ۱۸۲۰ء کے بعد تذکرے کے حاشیوں میں کثرت سے اضافے کیے گئے اور یہ عمل ۳۲-۱۸۳۱ء تک جاری رہا۔ اس طرح غالبؔ کے ترجمے اور اشعار دونوں میں خاصا اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ صرف غالبؔ کی شہرت ہی نہیں تھی بلکہ سرورؔ کی ان سے ذاتی شناسائی بھی تھی[1]۔ ترجمے میں یہ اضافہ ہوا۔

تخلّص کے بعد: "اسداللہ خاں عرف"

"یارباش" کے بعد: "و دردمند"

"متمکن" کے بعد: "تو کردۂ غم ہائے عشقِ مجاز، تربیت یافتۂ غمکدۂ نیاز،

درفنِ سخن سنجی متبعِ محاوراتِ میرزا عبدالقادر بیدلؔ

---

[1] قاضی عبدالودود مرحوم نے نواب الٰہی بخش معروفؔ کے دیوانِ دوّم (ہنوز غیر مطبوعہ) سے لے کر یہ شعر درج کیا ہے ۔ "لکھ غزل اک اور بھی معروفؔ! سرورؔ کے لیے

آج اسی پر نکتہ فہمی، نکتہ دانی ختم ہے" (معیار- پٹنہ، جولائی ۱۹۳۶ء- ص ۳۲۵)۔ ممکن ہے سرورؔ سے معروفؔ کی یہ دوستی بھی غالبؔ کے کام آئی ہو۔

علیہ الرحمہ و ریختہ در محاوراتِ فارسی موزوں می کند، بالجملہ موجدِ طرزِ خود است و با راقم رابطۂ یک جہتی مستحکم دارد"

اشعار میں ۲۳ شعر اور ایک رباعی کا اضافہ ہوا۔ وہ یہ ہیں ۔

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے   رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا یہ غم ہو تو پھر کس لیے اسدؔ   ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے
جگر سے ٹوٹی ہوئی ہو گئی سِناں پیدا   دہانِ زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا
خوباں کے جاننے کے میں قابل نہیں رہا   جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
نیازِ عشق خرمن سوزِ اسبابِ ہوس بہتر   جو ہو جاوے نثارِ برق مشتِ خار و خس بہتر
یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں واہ غلط   کی تصوّر نے بہ صحرائے ہوس راہ غلط
گلشن میں بند و بست بہ ضبطِ دگر ہے آج   قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسدؔ   خونِ زاہد کو مباح اور مالِ صوفی کو حلال
کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بہ سوزِ دل   دردِ جدائیِ اسداللہ خاں نہ پوچھ

اسدؔ کو بوریے میں دھر کے پھونکا موجِ ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

شکلِ طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے
ہوں میں وہ دام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے
ماہِ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سُلاتا ہے مجھے

پھر کچھ اس دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
[اس کے بعد اس غزل کے ۱۲ مزید شعر- پھر یہ مقطع]

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے
کب سنے ہے وہ کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے لوگ
مگر آشفتہ بیانی میری
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
تا اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
۳۳ دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
ہوتے ہوں ملول اس کو سن کر جاہل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اِن ۳۳ اشعار اور ایک رباعی میں ۴ اشعار ایسے ہیں جو سوائے "عمدۂ منتخبہ" کے

کسی اور مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخے میں نہیں پائے جاتے۔ وہ ہیں شعر نمبر (۱) اک گرم آہ کی ..... (۲) پروانے کا نہ غم .... (۵) نیازِ عشق خرمن سوز ...... (۶) یاد آیا جو وہ کہنا ..... اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ وہ غزلیں ہیں جو نسخۂ بھوپال بخطِ غالبؔ (۱۸۱۶ء) مرتّب کرتے ہوئے غالبؔ نے خارج کر دیں۔ لہٰذا ان کا زمانۂ فکر بھی ۱۸۱۲ء ہی کے آس پاس ہوگا۔

شعر ۳۔۴۔۷۔۸۔۹۔۱۰۔۱۱۔۱۲، نسخۂ بھوپال بخطِ غالبؔ (۱۸۱۶ء) کے متن میں موجود ہیں اس لیے ان کا زمانۂ فکر زیادہ سے زیادہ ۱۸۱۶ء قرار پایا۔ ؏ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا، اس غزل کے چار شعر نسخۂ بھوپال (حمیدیہ) (۱۸۲۱ء) کے حاشیے پر اور نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے متن میں موجود ہیں۔ اس لیے بیش از بیش ۱۸۲۲ء تا ۱۸۲۶ء کی کہی ہوئی ہے۔ ؏ پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے، اس غزل کے تمام شعر (۱۴) نسخۂ حمیدیہ (۱۸۲۱ء) کے آخر میں درج ہیں۔ اس لیے اس کا زمانۂ فکر بھی ۱۸۲۲ء تا ۱۸۲۶ء ہی ہوا۔ ؏ کب سنے ہے وہ کہانی میری، یہ مصرع جو بعد میں ؏ کب وہ سنتا ہے کہانی میری، میں تبدیل ہو گیا، ایک ایسی غزل سے ہے جو نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کی لچھمن ریکھا کو پار کرتی دکھائی دیتی ہے۔ اس کے کل شعر ۹ ہیں جن میں سے ۳ عمدۂ منتخبہ میں لیے گئے۔ یہ غزل نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے حاشیے پر ہے۔ قیاس چاہتا ہے کہ یہ اگرچہ نسخۂ شیرانی کی کتابت کے بعد کی ہے مگر ۱۸۲۶ء ہی میں کہی گئی ہوگی کیونکہ میری دانست میں عمدۂ منتخبہ میں غالبؔ کے ترجمے کے حواشی اور اشعار کے اضافے نومبر ۱۸۲۶ء تک مکمل ہو چکے تھے[1]۔ گو اس بات کا امکان ہے کہ تذکرے کے اوراق مزید شاعروں کے تراجم کے اندراج کے لیے چندے اور بھی

---

[1] بہر حال میں نے اس غزل کو نسخۂ شیرانی (۱۸۲۶ء) کے حاشیے پر ہونے کی وجہ سے، ۱۸۲۷ تا ۱۸۲۸ء کے دور ہی میں رکھا ہے

کھلے رکھّے گئے ہوں۔ ۱۸۲۶ء میں غالبؔ کو دِلّی آئے اور مستقل سکونت اختیار کیے ہوئے ۱۳، ۱۴ برس ہو گئے تھے۔ اس مدّت میں سرورؔ مؤلّفِ تذکرہ سے (جیسا کہ ترجمے میں بعد کے اضافے سے ثابت ہے) "رابطۂ یک جہتی" بھی مستحکم ہو چکا تھا۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ دسمبر ۱۸۲۶ء میں جب غالبؔ کلکتّہ کے دُور دراز سفر پر روانہ ہوئے تو وہ اپنے ترجمے میں کوئی کور کسر چھوڑ گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ ۱۸۲۶ء کے بعد تو دوسرے شاعر اپنا کلام اُنھیں دیتے تھے تاکہ وہ اپنے دوست نواب سرورؔ سے سفارش کر کے ان کا کلام داخلِ تذکرہ کرا دیں اور یہ بات غالبؔ کے خط بنام شیفتہؔ (مطبوعہ بنج آہنگ) سے ظاہر ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ قیامِ کلکتّہ کے دوران مرزا احمد بیگ خاں تپاںؔ نے اُنھیں اپنا کلام دیا تھا تاکہ جب وہ دِلّی لوٹیں اور اعظم الدّولہ (نواب سرورؔ مؤلّفِ تذکرہ) ان سے ملنے آئیں تو اُنھیں وہ تپاںؔ کا کلام تذکرے میں درج کرنے کے لیے دیں۔ ایسی حالت میں، اور غالبؔ کے مزاج کو جانتے ہوئے، یہ یقین نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت (۱۸۲۶ء) تک تذکرۂ سرورؔ یعنی عمدۂ منتخبہ میں ان کا ترجمہ کسی طرح بھی ادھورا رہا ہو بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آخری تین غزلیں۔ ؎

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے — سینہ جویائے زخمِ کاری ہے
کب سُنے ہے وہ کہانی میری — اور پھر وہ بھی زبانی میری
عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

غالبؔ کی بہترین غزلوں میں سے ہیں اور یقیناً خود غالبؔ کی فراہم کردہ ہیں۔

عمدۂ منتخبہ کے تعلّق سے یہاں تذکرۂ عیار الشّعراء کا کچھ حال بیان کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ تذکرہ عمدۂ منتخبہ سے دو سال پہلے شروع ہوا اور ایک سال بعد تک اس میں مسلسل اضافے ہوتے رہے۔ اس کا زمانۂ تصنیف ۱۲۱۳ھ/۹۹-۱۷۹۸ء تا ۱۲۴۸ھ/۳۳-۱۸۳۲ء

تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر اس کا ذکر عمدۂ منتخبہ کے بعد اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اس میں غالبؔ کا ترجمہ اسدؔ کے تحت نہیں بلکہ غالبؔ کے تحت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس میں ترجمۂ غالبؔ، ۱۸۱۶ء یا اس کے بعد داخل کیا گیا کیونکہ غالبؔ تخلّص ۱۸۱۶ء ہی سے استعمال میں آیا۔ ترجمے کے شروع کے الفاظ یہ ہیں "مرزا اسد اللہ عُرف مرزا نوشہ المتخلّص بہ غالبؔ ....." کل شعر دس ہیں جن میں دو شعر ایسے ہیں جو اور کہیں نہیں پائے جاتے۔ حتّٰی کہ نسخۂ بھوپال بخطِ غالبؔ (۱۸۱۶ء) میں بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ شعر غالبؔ کی کسی ابتدائی بیاض کے ہیں جو نسخۂ بھوپال بخطِ غالبؔ میں جگہ نہ پا سکے اور خارج کر دیے گئے۔ لہٰذا انہیں بھی ۱۸۱۲ء ہی کا فکر کردہ کہنا چاہیئے۔ وہ شعر یہ ہیں ؎

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے — ایسے ہنستے کو رُلایا ہے کہ جی جانے ہے
صبا، لگا وہ طپانچہ طرب سے بلبل کی — کہ روئے غنچۂ گُل، سوئے آشیاں پھر جائے

مجھے بتایا گیا ہے کہ غیر مطبوعہ تذکرۂ طبقاتِ سُخن میں لکھّا ہے کہ خوب چند ذکاؔ مؤلّفِ تذکرۂ عیار الشّعرا، نواب سرورؔ مؤلّف تذکرۂ عمدۂ منتخبہ کے وہاں منشی گیری پر ملازم تھا اور کہ جو کچھ وہ عمدۂ منتخبہ میں درج کرتا تھا وہی گھر جا کر اپنے تذکرے عیار الشّعرا میں شامل کر لیا کرتا تھا۔ یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی اس لیے کہ :

(ا) تذکرہ عیار الشّعرا کی بنیاد عمدۂ منتخبہ سے دو سال پہلے پڑ چکی تھی

(ب) دونوں کے یہاں ترجمۂ اسدؔ (غالبؔ) میں بہت فرق ہے اور دونوں ترجموں میں اشعار اور تعدادِ اشعار بھی ایک سے نہیں

(ج) صاحبِ تذکرۂ عمدۂ منتخبہ نے اپنے یہاں ذکاؔ کا ترجمہ دیا ہے اور لکھّا ہے

"..... جوانے سلیم الطّبع، مزاجش بہ صلاحیت راغب، کلامش نمکین ....
مشارالیہ ہم تذکرۃ الشّعرا تالیف کردہ۔ در علم اخلاص و دوستی راسخ دریافت گردیدہ ..... (۵۷ شعر)"

یعنی خود صاحبِ تذکرہ (نواب سرورؔ) ذکاؔ کے تذکرے کا ذکر کرتے ہیں اور ذکاؔ کو تحقیق

مخلص اور دوست جانتے ہیں اور کہیں اشارہ تک نہیں کرتے کہ ذکاؔ ان کے پاس ملازم تھا۔

اب ۱۹۹۱ء میں ڈاکٹر نسیم اقتدار علی نے تذکرۂ طبقاتِ سخن (از غلام محی الدین مبتلا وعشق میرٹھی) شائع کر دیا ہے۔ اس میں ذکاؔ کے ترجمے میں لکھا ہے:

"از سرکارِ اعظم الدولہ بہادر است۔ چنانچہ حسب الفرمایشِ
نواب موصوف تذکرۂ ہندی ہم تالیف کردہ است . . . ." ص ۱۳۹

یعنی ذکاؔ، اعظم الدولہ نواب سرورؔ کی ڈیوڑھی سے وابستہ ہیں اور انھوں نے نواب صاحب کی فرمایش پر ایک "تذکرۂ ہندی" بھی تالیف کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ نواب سرورؔ کا اپنا بیان جو اوپر (ج) کے تحت درج ہے زیادہ معتبر ہے۔

استدراک

معیار۔ پٹنہ مئی ۱۹۴۷ء کے شمارے میں قاضی عبدالودود مرحوم نے پہلی بار غالبؔ کے ۱۳ اشعار، جو اس وقت غیر مطبوعہ تھے، "دفتر ہند لندن" کے نسخۂ تذکرۂ عمدۂ منتخبہ سے لے کر شائع کیے تھے۔ پھر جولائی ۱۹۴۷ء میں ایک مختصر مضمون بھی لکھا تھا مگر اس وقت قاضی صاحب کے پیش نظر دوسرے ماخذ نہ تھے۔ اس لیے یہ ابتدائی مضمون اس قابل نہ تھا کہ اس سے استفادہ کیا جا سکتا۔ ایک معترض کا جواب دیتے ہوئے پروفیسر عطا الرحمٰن عطاؔ کاکوی میرے مضمون کے بارے میں لکھتے ہیں (ایوانِ اردو۔ دہلی ص ۵۵۔ شمارہ ستمبر ۱۹۸۷ء)

"قاضی صاحب نے لندن والے نسخے کو اس وقت دیکھا جب وہ میدانِ تحقیق میں نئے نئے اترے تھے۔ اس نسخے کے ترقیمے پر ان کی نظر نہ گئی کہ ۱۲۴۲ھ میں غالبؔ کے ایسے اشعار کس طرح درج ہوئے۔ گیان چند صاحب نے ایک دوسرے نسخے سے اس گتھی کو بہ حسن و خوبی سلجھایا ہے جو قابلِ داد ہے ---------"

حرفِ نامعتبر

"دیوانِ غالبؔ (کامل) تاریخی ترتیب سے" کے پہلے ایڈیشنوں میں بعض اشعار ایسے ہیں جنھیں حتمی طور پر غالبؔ کے فکر کردہ تسلیم کرنے میں مجھے جھجک محسوس ہوتی رہی ہے۔ اب میں نے اُن اشعار کو متن سے الگ کر لیا ہے۔ تاہم مقدمے میں محفوظ رکھا ہے تاکہ اگر قاری اُن پر مزید غور کرنا چاہے تو اشعار اس کی نظروں سے اوجھل نہ رہیں۔ روایتیں بیشتر وہی ہیں جو نسخۂ عرشی میں بیان ہوئی ہیں:

(۱) دو زندگیاں یہ زمانے کی، جیتے جی ہیں سب
کہ مُردوں کو نہ بدلتے ہوئے کفن دیکھا

---

(۲) پیری میں بھی کمی نہ ہوئی تاک جھانک کی
روزن کی طرح دید کا آزار رہ گیا

---

(۳) وہ مرغ ہے خزاں کی صعوبت سے بے خبر
آیندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا

پہلے شعر میں جیتے اور مُردوں کے آخری حروف بُری طرح دیتے ہیں۔ ایسے ناپختہ کلام کو غالبؔ سے منسوب کرنا دُرست نہیں معلوم ہوتا۔ دوسرے دونوں شعر صاف ہیں۔ دیوانِ غالبؔ (صدی ایڈیشن) مرتبہ مالک رام میں یہ اشعار بیاضِ علائی کے حوالے سے نقل کیے گئے ہیں مگر جناب عرشیؔ مرحوم فرماتے ہیں کہ "اس بیاض سے متعلق میری یادداشتوں میں ان شعروں کا حوالہ نہیں"۔

(۴) اُٹھا اک دِن بگولا سا جو کچھ میں، جوشِ وحشت میں
پھرا آسیمہ سر، گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے

(۵) نظر آیا، مجھے اک طائرِ مجروحِ پَر لختہ
ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے

(۶) کہا میں نے کہ "او گمنام، آخر ماجرا کیا ہے؟"
پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے

(۷) ہنسا کچھ کھِل کھِلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا
تو یہ رویا کہ جُوے خون بہی پلکوں کے داماں سے

(۸) کہا: "میں صید ہوں اُس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آکر باغِ رضواں سے

(۹) اُسی کے زُلف و رُخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو
نہ مطلب کفر سے ہے، اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے"

(۱۰) بچشمِ غور جو دیکھا، مرا ہی طائرِ دل تھا
کہ جل کر، ہو گیا یوں خاک میری آہِ سوزاں سے[۱]

(۱۱) ایک[۲] اہلِ درد نے سُنسان جو دیکھا قفس
یوں کہا "آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب"

(۱۲) بال و پَر دو چار دکھلا کر، کہا صیاد نے
"یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب"

---

[۱] یہ قطعہ رسالہ مخزن اپریل ۱۹۰۷ء میں اس تمہید کے ساتھ شائع ہوا تھا:
"تھوڑے دِن ہوئے میجر سیّد حسن صاحب بلگرامی سے تذکرۂ شعراء ہو رہا تھا جس میں اُنھوں نے غالبؔ کا ایک قطعہ سُنایا۔ قطعے کے عمدہ ہونے میں کیا شک ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ان کے اس بیان نے کہ یہ قطعہ اُن کے والدِ مرحوم سے اُن کو پہنچا اور اب تک غالبؔ کے کسی کلام میں شایع نہیں ہوا، اس کی خوبی زیادہ کر دی۔ مَیں نے اُن سے لکھ لیا اور اُن کی اجازت سے مخزن کو بھیجتا ہوں۔ شیدا از کیمبرج ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مولانا نظامی بدایونی مرحوم نے اپنی شرحِ دیوانِ غالب ص ۲۴۸ میں اس قطعے اور قطعہ نمبر ۲ کے متعلق لکھا ہے کہ سب سے پہلے ان قطعات کا اضافہ طبعِ سوم میں اِس ریمارک کے ساتھ ہُوا تھا کہ بعض نقّادانِ سخن ان قطعات کے طرزِ بیان کو حضرتِ غالب کے رنگ سے جُداگانہ سمجھتے ہیں۔ اس پر طبعِ سوم کے ناظرین میں سے بعض اہل الرّائے حضرات نے شکایت کی کہ ان قطعات کو دیوانِ غالب میں جگہ دینا غالب کے کلام کی توہین کرنا ہے۔ ہم نے نواب عماد الملک (میجر سیّد حسن بلگرامی کے بھائی) سے اُن کے متعلق دریافت کیا۔ وہ فرمانے لگے کہ وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ غالب کے مصنّفہ ہیں۔ اُنھوں نے اپنے ایک بزرگ سے سُنے تھے جو اُن کو غالب سے منسوب کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ غالب کا ابتدائی کلام ہو۔

یعنی (۱) شیدا نے ان اشعار کو میجر سیّد حسن بلگرامی سے لیا اور سیّد حسن صاحب کو یہ اُن کے والد صاحب سے پہنچے اور (۲) نظامی بدایونی صاحب کے دریافت کرنے پر سیّد حسن صاحب کے بھائی نے تصدیق کی کہ اُنھوں نے اپنے ایک بزرگ سے (اپنے والدِ مرحوم سے نہیں) سُنا تھا اور اس لیے وہ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ غالب کے مصنفہ ہیں۔ یہ روایت خاصی ضعیف ہے۔

جناب قاضی عبدالودود نے اپنے مضمون "کُتب خانۂ خدابخش اور غالب" مشمولۂ اُردوے معلّیٰ، دہلی، 'غالب نمبر' حصّہ دوم، ص ۸۷ میں لکھا ہے کہ

"دیوانِ غالب اُردو کے ان نسخوں میں سے جو غالب کے دورانِ حیات میں طبع ہو چکے تھے یہاں موجود ہیں: نسخۂ مطبع احمدی، مطبعِ نظامی — مقدّم الذّکر کے یہاں دو نسخے تھے، جن میں سے ایک کا باوجودِ تلاش اس وقت پتا نہ ملا۔ اس کے آخر میں جناب قاسم حسن خان (برادر زادۂ خدابخش خاں منتظم کُتب خانہ) کے قول کے مطابق غالب کا ایک قطعہ ہے جو محمد بخش خاں پدرِ خدابخش خاں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ یہ قطعہ وہی

ہے جو عماد الملک بلگرامی کی روایت پر غالب سے منسوب کیا گیا ہے۔ نیز مخزن میں اس قطعے کو شائع کرنے والے صاحب کا نام شیدا لکھا گیا ہے۔ یہ عبدالحمید خواجہ ہیں۔ جو اُن دنوں کیمبرج میں مقیم تھے......"

(ابھی میں نے معلوم کر لیا ہے کہ قطعہ ۲ "صداے عندلیب" غالب کے شاگرد مرزا عبدالصمد بیگ فی اکبر کا ہے (دیکھو دیوانِ فخر اکبر ص ۱۲) ما

(۱۳) جو حدِ تقویٰ ادا نہ ہووے تو اپنا مذہب یہی ہے غالبؔ
ہوس نہ رہ جائے کوئی باقی، گناہ کیجیے تو خوب کیجے

رضا لائبریری، رام پور کے نسخۂ تذکرۂ گلزارِ سخن مؤلفہ جگن ناتھ فیض کے، جو ۱۹۰۸ء میں نول کشور پریس میں طبع ہُوا ہے، صفحہ ۲۹۷ پر غالب کا تذکرہ ہے۔ اس صفحے کے زیریں حاشیے میں چُنّی لال عاصی نے مطالعہ کرتے وقت غالب کے تحت یہ شعر لکھا ہے۔

(۱۴) اگر ہوتا تو کیا ہوتا، یہ کہیے
نہ ہونے پر ہیں یہ باتیں دہن کی

یہ شعر ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی صاحب نے رسالہ اُردوے معلّیٰ، دہلی کے غالب نمبر حصّہ دوم ۱۹۶۰ء میں چھاپا ہے۔ اُن کا بیان ہے کہ میرے ایک بزرگ تھے سیّد عنایت حُسین صاحب جو بھوپال میں ملازم تھے۔ نواب صدیق حسن خاں سے اُن کے خصوصی تعلّقات تھے۔ نواب صاحب کے بھائی سیّد احمد حسن (متوفی ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۱ء) غالب کے شاگرد تھے اور عرشی تخلّص کرتے تھے۔ سیّد عنایت حُسین صاحب نے اپنے منتخب اشعار کی ایک بیاض چھوڑی ہے۔ اس میں پہلے عرشی کا یہ شعر لکھا ہے:

کہیں کچھ ہے، دُعا دو گالیوں کو
بنا لی بات باتوں میں دہن کی

اس کے بعد غالبؔ کا یہ شعر درج کیا ہے "اگر ہوتا..... الخ

(۱۵) نسخۂ سوزشِ دل درخورِ عتّاب نہیں
سرِ سودا زدہ، آتش کدۂ تاب نہیں

---

(۱۶) ہمّت و حوصلۂ شورشِ شبنم معلوم
قلزمِ اشک، نمِ دیدۂ خوناب نہیں

---

(۱۷) پُرسشِ عشق سے ہے اُن کو فراغت مقصود
ہدیۂ پارۂ دِل، نازشِ جلباب نہیں

---

(۱۸) ہمّت و شوقِ طلب گاریٔ مقصود کہاں
برقِ خرمن زنِ بے تابیٔ سیماب نہیں

---

(۱۹) گلشنِ ہستیِ عالم ہے دبستانِ نشاط
نقشِ گل، رونقِ بے مشقِ طلّاب نہیں

اس غزل کا پہلا اور تیسرا شعر سب سے پہلے رسالہ "الناظر" لکھنؤ بابت مارچ ۱۹۲۹ء میں اس تمہید کے ساتھ شائع ہوا تھا:

"مولوی عبدالرزّاق صاحب ایڈیٹر رسالہ تحفہ حیدرآباد دکن، مؤلف کلیاتِ اقبال نے عرصہ ہوا ازراہِ کرم الناظر میں شائع ہونے کے لیے اشعارِ بالا ارسال فرمائے تھے اور ان کے متعلق اپنے گرامی نامے میں تحریر فرمایا تھا کہ یہ شعر بھوپال کے مطبوعہ نسخے

میں نہیں ہیں اور نہ کہیں چھپے ہیں۔ میرے کتب خانے میں دیوانِ غالبؔ کے مختلف نسخے ہیں، ایک نسخہ نولکشور کا مطبوعہ ہے۔ اس کے حاشیے پر اشعارِ بالا اس تقریب کے ساتھ کسی صاحب نے لکھّے ہیں کہ مرزا غالبؔ کے قلمی دیوان سے یہ غزل نقل کی گئی۔ دو شعروں کے علاوہ غزل کے اور شعر بھی ہیں، لیکن بے درد جلد ساز نے حاشیہ کاٹ دیا ہے، جس کے سبب سے بعض مصرعے بالکل کٹ گئے ہیں اور بعض پڑھے نہیں جاتے کہیں اور پتا چلے، تو بقیہ اشعار بھی ارسال کر دوں گا۔

بعد ازاں یہ شعر 'ماہِ نو' فروری ۱۹۵۳ء میں مع چند اضافوں کے اس تمہید کے ساتھ چھپے۔

"پچھلے صفحے پر غالبؔ کی جو مبینہ غزل درج ہے، ہمیں جناب ناظر عالم نے حیدرآباد دکن سے ارسال کی ہے۔ موصوف نے اس سلسلے میں ایک خط بھی لکھّا ہے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کس حد تک مستند ہے۔ خط میں ناظر عالم صاحب نے اس غزل کی دریافت اور ضائع شدہ حصّوں کے بارے میں عبدالرزّاق راشدؔ صاحب کا یہ بیان نقل کیا ہے۔ موصوف نے کہا کہ "میاں داد سیّاحؔ شاگردِ مرزا غالبؔ کے ایک رشتے دار ظفریاب خاں ریاستِ حیدرآباد کے صیغۂ تعمیرات میں ملازم تھے۔ آج سے ۴۰، ۴۲ سال پہلے 'رسالۂ ادیب' نکالتے تھے۔ خان موصوف کے کتب خانے میں ایک مجلّد کتاب ملی، جس کے اندر 'دیوانِ غالبؔ' اور 'دیوانِ ذوقؔ' کے علاوہ ناسخؔ، آتشؔ، آبادؔ کا کلام تھا۔ 'دیوانِ غالبؔ' کے ایک حاشیے پر 'غزلِ غیر مطبوعۂ غالبؔ دہلوی' عنوان سے ۹ شعر لکھّے تھے مگر کسی بے درد جلد ساز نے جلد بناتے وقت حاشیے کا ایک حصّہ اس بُری طرح کتر دیا تھا کہ چار مصرعے کٹ گئے جو اشعار اور مصرعے باقی تھے، اُن کی نقل کر لی گئی۔ اس تحقیق کے لیے کہ یہ کلام میرزا غالبؔ ہی کا ہے، ظفریاب خاں ایڈیٹر 'ادیب' سے رجوع کیا گیا، خاں صاحب موصوف نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ 'غالبؔ کے سوا ایسے شعر اور کون تصنیف کر سکتا ہے.......'

تحقیق کا دوسرا ذریعہ یہ تھا کہ حضرت استاذی علّامہ نظم طباطبائی شارحِ غالبؔ

سے رجوع کیا جائے۔ موصوف نے غزل دیکھ کر فرمایا کہ یہ یقینی مرزا غالبؔ کا کلام معلوم ہوتا ہے"۔ جو چار شعر جلد ساز کی غلطی سے کٹ گئے تھے، اُن کے مصرعِ ہائے ثانی یہ ہیں۔ ؎

شبِ تاریک، خیالِ دلِ مہتاب نہیں

شمع یہ، زیب دہِ مجلسِ احباب نہیں

تارِ تمکین، حریفِ سرِ مضراب نہیں

غم ہی ایک چیز ہے دنیا میں جو کمیاب نہیں

جب تک پہلے مصرعے نہ مل جائیں ان مصرعوں کو متن سے خارج کر دینا ہی مناسب ہوگا۔ لیکن اس کلام کو معتبر سمجھنے سے پہلے جناب عرشیؔ مرحوم کا یہ بیان مطالعہ کر لینا ضروری ہے جو انھوں نے دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی، اشاعتِ دوّم کے ص ۵۲۲ پر درج کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"تمکینؔ کاظمی مرحوم نے مجھے لکھّا تھا کہ ناظرِ عالم نام کی کسی ہستی کا خارج میں وجود نہیں اور اس پردے میں خود عبدالرزاق حیدرآبادی جلوہ فرما ہیں۔ اس اطّلاع نے غزل اور اس سے متعلق روایت کو ناقابلِ اعتبار بنا دیا۔۔۔۔۔۔۔"

(۲۰) اس قدر ضبط کہاں ہے کبھی آ بھی نہ سکوں
ستم اتنا تو نہ کیجے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں

(۲۱) لگ گئی آگ اگر گھر کو تو اندیشہ کیا
شعلۂ دل تو نہیں ہے کہ بُجھا بھی نہ سکوں

(۲۲) تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں
موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بُلا بھی نہ سکوں

(۲۳) ہنس کے بُلوائیے مٹ جائے گا سب دل کا گِلہ
کیا تصوّر ہے تمھارا کہ مٹا بھی نہ سکوں

اس غزل کے سلسلے میں مولانا حامد حسن قادری مرحوم نے بہت دلچسپ اطّلاع بہم پہنچائی ہے۔ اپنے مکتوب بنامِ حیرتؔ شملوی مرحوم میں رقم طراز ہیں: "میرے پاس بزرگوں کے وقت کا 'دیوانِ غالبؔ' ہے، مطبوعہ ۱۸۶۳ء جو مطبعِ مفیدِ خلائق، آگرہ میں منشی شیو نرائن کے اہتمام سے چھپا تھا۔ اس میں میرے والدِ مرحوم کے قلم سے (نیرنگ میں لکھّا ہے کہ ان اشعار کے کاتب و ناقل دونوں صادق علی صاحب ہیں۔ عرشی) دو شعر یہ لکھّے ہوئے ہیں، جو کسی مطبوعہ دیوان میں نہیں ملتے: لگ گئی آگ۔۔۔ الخ، تم نہ آؤ گے تو۔۔۔ الخ۔ غزل کے تین مطبوعہ شعر ہر دیوان میں موجود ہیں۔ میں نے غالباً ۱۹۳۰ء (صحیح خاص نمبر جنوری ۱۹۲۸ء ہے۔ عرشی) میں عزیز اللہ خاں رام پوری مرحوم کے رسالہ نیرنگ میں ان اشعار کے متعلق ایک مختصر مضمون چھپوایا تھا۔ اس میں لکھّا تھا:

"ان اشعار کے ناقل مولوی صادق علی تاباںؔ، ساکن گڑھ مکتیشر، ضلع میرٹھ، انسپکٹر محکمۂ نمک ہیں۔ مولوی صاحب غالبؔ کے زمانے کے بزرگ تھے۔ غالبؔ سے چند بار ملے تھے۔ خود اچھّے شاعر اور عُمدہ سُخن سنج تھے۔ گورنمنٹ سے سالہا سال پنشن لے کر ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں انتقال کیا۔ میری تحقیق کے مطابق اس بات کا قوی قرینہ ہے کہ مولوی صاحب نے خود غالبؔ سے یا اُسی زمانے کے کسی شخص نے یہ اشعار نقل کیے ہیں۔ ممکن ہے کہ غالبؔ نے دیوان کی طباعتِ آخری کے بعد یہ شعر کہے ہوں۔ دونوں شعر بالکل اُسی رنگ کے ہیں

جیسے پہلے تین شعر ہیں، اور ایسے نہیں ہیں کہ پانچوں شعر ایک ساتھ کہنے کے بعد غالب کاٹ دیتے اور پہلے تین شعر باقی رکھتے۔ اب نقادانِ غالب فیصلہ کریں اور اس اضافے سے لطف اندوز ہوں۔"

اس کے ایک عرصے کے بعد میں نے یہی مضمون دوسری طرح لکھ کر "رسالۂ سب رس" حیدرآباد دکن، بابت مارچ ۱۹۴۲ء میں چھپوایا تھا۔ 'سب رس' والا مضمون مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی کی نظر سے گزرا، تو انھوں نے مجھے لکھا:

"ان میں سے ایک شعر کوئی تیس سال قبل سُنا ہوا، میرے حافظے میں ان الفاظ میں ہے:

تم نہ آؤ گے، تو مرنے کی سو راہیں ہیں
موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بُلا بھی نہ سکوں

ایک یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ اُس وقت یہ شعر میں نے جالب کی جانب منسوب سُنا تھا۔ سیّد جالب دہلوی سے تو آپ واقف ہوں گے۔ 'ہمدم' لکھنؤ، کے ایڈیٹر، حالی کے شاگرد اور اس طرح غالب کے شاگرد در شاگرد۔

آپ کی اطلاع اور تحقیقِ مزید کے لیے لکھ رہا ہوں - - - - - - - -"

اس کے بعد مجھے مزید تحقیق کا موقع نہیں ملا کہ سیّد جالب کے کلام میں تلاش کرتا، یا اُن کے دوستوں سے پوچھتا۔ اب یہ بھی ممکن ہے کہ دوسرا شعر بھی جالب ہی کا ہو۔ عبدالماجد صاحب نے ایک سُنا، ایک نہ سُنا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شعر میں غالب و جالب کو توارد ہوگیا ہو۔ اس لیے یہ قافیہ سوچتے وقت جب "بُلا بھی نہ سکوں" ذہن میں آئے گا، تو ایسی دو ہی چیزیں ہیں موت اور دوست، اس لیے یہ مصرع تو بنا رکھا ہے: "موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بُلا بھی نہ سکوں"۔ اب پہلے مصرع میں وہی بات کہنے کی تھی جو دونوں نے کہی۔ لیکن اپنے اپنے الفاظ میں کہی۔ میرے خیال میں غالب کی یہ زبان نہیں ہے، "مرنے کی سو راہیں ہیں"۔

بہرحال اب آپ جانیں اور عرشی صاحب جانیں۔ میرا سلام کہیے گا۔"

مولانا حامد حسن قادری کے اس بیان کے علاوہ ایک اور شہادت بھی ہمارے سامنے ہے۔ اس سے جہاں اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے کہ زیرِ بحث اشعار غالب ہی کے ہیں، وہاں مطلع اور شعر "ہنس کے بلوائیے۔۔" الخ مزید دریافت ہوئے ہیں۔

کلیاتِ اقبال کے مرتّب عبدالرزّاق راشد حیدرآبادی مرحوم نے رسالۂ "تحفہ" حیدرآباد کی جلد ۶ شمارہ ۸، ۹ بابت شعبان، رمضان ۱۳۴۴ھ میں ایک نوٹ کے ساتھ یہ مکمّل غزل شایع فرمائی تھی۔ انھوں نے اس کے متعلق جو معلومات "کلامِ غالب غیر مطبوعہ" کے زیرِ عنوان درج کی تھیں، انھیں یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"میرزا غالب کا یہ کلام جسے ہم ذیل میں تبرکًا درج کرتے ہیں ہمیں اُن کے ایک شاگرد قاضی عنایت حُسین مرحوم کی بیاض سے دستیاب ہوا ہے۔ مولانا حسرت موہانی اپنے مرتبہ دیوان میں غالب کے شاگردوں کا ذکر کرتے ہیں، لیکن قاضی مرحوم کا نام نہیں لیتے۔ شعراء کے تذکروں میں بھی جو ہماری نظر سے گزرے ہیں اُن کے حالات کا پتہ نہیں چلتا۔ ہم اپنی معلومات کی بنیاد پر چند باتیں یہاں بیان کرتے ہیں۔

خاندان بنی حمُید کے ایک بزرگ علی نقی الدّین کے بیٹے قاضی عنایت حُسین مرحوم بداوں کے رہنے والے تھے۔ رشکی تخلّص کرتے تھے۔ اچھے خاصے شعر کہتے تھے۔ ملازمت کے تعلّق سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں قیام کیا۔ کچھ عرصے تک ریاست ٹونک میں ملازم رہے۔ اسی مقام پر مرزا غالب سے تلمّذ اختیار کیا۔ (مرزا صاحب کا سفرِ ٹونک محلّ نظر ہے۔ عرشی) جبکہ والیِ ٹونک کی خواہش پر اُن سے ایک دو دفعہ ملنے گئے تھے۔ ۱۸۸۳ء میں حیدرآباد آئے اور ۱۹۰۸ء تک یہیں مقیم رہ کر رودِ موسیٰ کی مشہور طغیانی کے زمانے میں وطنِ مالوف چلے گئے، مگر وہاں ان کا جی نہ لگا۔ ۱۹۱۲ء میں پھر عازمِ دکن ہوئے، دکن پہنچ کر جام باغ کے محلّے میں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۱۸ء میں قضا ان کو

ہندوستان کھینچ لے گئی۔ وہیں پیوندِ خاک ہوئے اور ایک اگلے وقتوں کی صورت مٹ گئی۔

اس امر کی نسبت کہ ذیل کے شعر غالب کے ہیں، ہم نے علامہ سیّد علی حیدر نظم طباطبائی نواب حیدر نواز جنگ سے (جن کی غالب شناسی بہت مشہور ہے اور جن کے دیوانِ غالب کی شرح لکھنے کے بعد غالب پر سے مہمل گوئی کا الزام اُٹھا) تحقیق چاہی، اور دیگر صاحبانِ ذوق سے بھی استفسار کیا۔ یہ سب اصحاب علامہ طباطبائی کے اس جواب سے اتفاق کرتے ہیں کہ:

"بیاضِ رشکی میں سے تین شعر (صحیح: چار۔ عرشی) جو مرزا غالب کے نام سے لکھے ہوئے ہیں، یہ مجھے بھی بلاشبہ غالب کا کلام معلوم ہوتا ہے۔" خود ہماری نظر جہاں تک کام دیتی ہے، ہم اس کو غالب ہی کا کلام سمجھتے ہیں۔ اگر کسی صاحب کو اس میں شک و شبہ ہو تو اُمید ہے کہ وہ معقول وجوہ و دلائل کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار فرمائیں گے۔

رشکی کی بیاض میں یہ غیر مطبوعہ کلام جس طرح لکھا ہوا ہے ہم اس کو بجنسہٖ یہاں نقل کرتے ہیں۔"

اس نوٹ کے بعد یہ ایک سطر بھی رسالۂ "تحفہ" میں غزل سے پہلے درج ہے جو بیاضِ مذکورہ ہی سے نقل ہوئی ہے کہ:

"یہ غزل مرزا صاحب پوری، دیوان میں طبع نہیں ہوئی ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ "بیاض میں اندراج کرنے والے کو اس بات کا علم تھا کہ اس غزل کے تین شعر پہلے سے دیوانِ غالب میں موجود ہیں اور یہ کہ ابھی تک یہ مکمل شکل میں کہیں شائع نہیں ہوئی ہے۔

ان سارے بیانات کے پیشِ نظر یہ بات قابلِ تحقیق ہو جاتی ہے کہ نو دریافت شعر بھی غالب ہی کے ہیں اور اُن کا انتساب غالب یا کسی دوسرے شخص کی طرف صحیح ہے

یا غلط۔"

(۲۴) وصل میں ہجر کا ڈر یاد آیا
عینِ جنّت میں سقر یاد آیا

---

(۲۵) مزہ تو جب ہے کہ اے آہِ نارسا، ہم سے
وہ خود کہے کہ 'بتا تیری آرزو کیا ہے؟'

---

(۲۶) حالت ترے عاشق کی یہ اب آن بنی ہے
اعضا شکنی ہو چکی، اب جاں شکنی ہے

---

(۲۷) گھر سے نکالنا ہے اگر، ہاں نکالیے
ناحق کی حُجّتیں نہ مری جاں، نکالیے

---

(۲۸) لیں بوسہ، یا مصیبتِ ہجراں بیاں کریں
اِک مُنہ ہے، کون کون سے ارماں نکالیے

---

(۲۹) جو معشوق زلفِ دوتا باندھتے ہیں
مرے سر سے کالی بلا باندھتے ہیں

قاضی معراج دھولپوری مرحوم کے پاس 'باغِ مہر' نام کی ایک کتاب محفوظ تھی۔ جسے میر مہر علی اکبر آبادی نے ۷ صفر ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۵ اگست ۱۸۶۱ء روز پنجشنبہ کو تمام کیا تھا۔ اس میں اشعارِ متفرّق کے تحت "مرزا نوشہ" کے نام سے بھی شعر درج تھے۔ یہ

شعر (۲۴ تا ۲۹) اُنھی میں کے ہیں۔ یہ اشعار قاضی صاحب نے تبرکاتِ غالبؔ کے عنوان سے 'ہماری زبان' کے شمارہ ۸ اگست ۱۹٦۱ء میں شایع کرائے تھے۔

(۳۰) نتیجہ اپنی آہوں کا ہے شکلِ مستوی پورا
ہیولیٰ صورتِ کابوس پھر خوابِ گراں کیوں ہو

یہ شعر فاضل زیدی صاحب نے رسالۂ طوفان، نواب شاہ کے شمارہ جولائی ۱۹۵۱ء میں اس تمہید کے ساتھ شائع کیا تھا:

"سیّد احمد حسین میکشؔ شاگردِ غالبؔ جو بعدِ غدر بے جُرم وخطا انگریز کے عتاب کا نشانہ بنے، غدر سے قبل کچھ دنوں پالوڈی میں مقیم رہے ہیں۔ میر اُمید علی، رئیس شاہ پور (پالوڈی) اور اُن کے درمیان رشتۂ اخلاص ومحبت تھا اور اُنھی کی کشش اُن کو پالوڈی کھینچ لائی تھی۔ میکشؔ نے اپنے استاد کی مشہور غزل (سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نُمایاں ہوگئیں، اور کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو) میر صاحب کو بطورِ تحفہ نقل کر کے دی تھیں جو ان کے صاحبزادے حکیم حبیب حسین کی ملکیّت رہیں اور اب حکیم مرحوم کے لواحقین کے پاس ہیں۔ آخرالذکر غزل میں مروّجہ غزل سے ایک شعر زائد ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالبؔ نے یہ شعر بعد میں غزل سے خارج کر دیا۔ میکشؔ کو یہ اتفاقاً زبانی یاد تھا۔ اس لیے انھوں نے لکھ دیا اور محفوظ رہ گیا۔"

غالبؔ کے بعض غیر مُتداول اُردو اَشعار کا زمانۂ فکر

جناب امتیاز علی خاں عرشیؔ مرحوم نے دیوانِ غالبؔ کچھ اس طرح مدوّن کیا ہے کہ اب اس کے مطالعے سے غالبؔ کے کلام کا عہدِ تخلیق بھی، ماخذوں کی مُفصّل نشاندہی کے سبب سے، ایک حد تک متعیّن کیا جا سکتا ہے تاہم بعض اشعار ایسے ہیں جن کا عہد معلوم نہیں ہو سکا۔ میں نے ذیل میں ایسے ہی اشعار کا زمانۂ فکر متعیّن کرنے کی کوشش کی ہے۔ روایتیں بیشتر وہی ہیں جو نُسخۂ عرشیؔ میں بیان ہوئی ہیں۔ مگر کوشش کی گئی ہے کہ اصل ماخذوں کو بنظرِ خود دیکھ لیا جائے اور اگر ہو سکے تو اپنے کُتب خانے سے ان کو مزید تقویت پہنچائی جائے تاکہ غلطی کا امکان نہ رہے۔
اس کے بعد نتائج کے لیے میں نے ماخذوں اور اپنے فہم ہی پر بھروسا کیا ہے۔ پہلے غالبؔ کے اشعار درج کیے گئے ہیں اور بعد میں اشعار کے زمانۂ فکر کے تعیّن کی کوشش میں اپنے معروضات۔

(۱) خوشی جینے کی کیا، مرنے کا غم کیا
ہماری زندگی کیا، اور ہم کیا

یہ شعر مکتوباتِ امیرؔ مینائی مرتّبۂ مولوی احسن اللہ خان ثاقبؔ صفحہ ۱۲۱ کے حاشیے سے ماخوذ ہے۔ ثاقبؔ نے نواب یوسف علی خاں بہادر ناظمؔ کے بارے میں متن میں لکھا ہے "نواب ناظمؔ کا پہلا دیوان جو عرصہ ہوا چھپا تھا اور اب کمیاب ہے مرزا غالبؔ کا دیکھا ہوا ہے۔"

حاشیے میں لکھا ہے " خاکسار کو جولائی ۱۹۰۸ء میں خوابیدگانِ تربت گاہِ تقدّس کی توجّہ اور (رباعی[1])

فرخندہ جہانِ بے مثالی　　ممدوحِ ادانی واعالی
پیرایۂ صدق و مایۂ فضل　　شمس العلماء جناب حالیؔ

کا اشتیاقِ زیارت پانی پت لے گیا۔ میں ایک روز یہ مسوّدہ اُن کو سُنا رہا تھا۔ جب اس مقام پر پہنچا تو مولانا نے فرمایا کہ نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہؔ فرماتے تھے کہ ایک روز مرزا غالبؔ نے مجھے یہ مطلع سُنایا۔ میں نے بہت تعریف کی، تو فرمایا کہ بھیّا، میں تو یہ شعر ناظمؔ کو دے چکا، مطلع خوشی[2] جینے کی ... الخ۔" اس کے قطعِ نظر کہ یہ شعر دیوانِ ناظمؔ (نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور) میں شامل نہیں یہ کوئی ایسی تخلیق نہیں جس پر شیفتہؔ یا غالبؔ سر دُھنتے۔ نواب رام پور (ناظمؔ) ۱۸۶۵ء میں فوت ہوئے۔ اس لیے شعر یقیناً اس سے پہلے کا ہے۔

دیوانِ ناظمؔ مطبوعہ ۱۲۷۸ھ ص ۲۱۶ پر سلام کے مقطع کا پہلا مصرع دیکھیے ؎

"ہم کیا ہیں ناظمؔ اور ہمارا سلام کیا"

شعر سے اس کا کوئی تعلّق نہیں لیکن اس مصرع کا اسلوب وہی ہے جو شعر کے مصرعِ ثانی کا ہے۔

---

1. اگرچہ ثاقبؔ مرحوم نے رباعی لکھا ہے تاہم وزن کی رُو سے قطعہ ہے۔
2. دیوانِ حالیؔ مطبوعہ ۱۸۹۳ء کے حصّۂ مقدّمہ کے ص ۱۷ پر بھی حالیؔ نے اس شعر کو مرزا غالبؔ ہی سے منسوب کیا ہے

(۲)　مسلمانوں کے میلوں کا ہوا قُل
سُنے ہیں جوگ مایا اور دیبی
نشان باقی نہیں ہے سلطنت کا
مگر ہاں، نام کو اورنگ زیبی

دیبی سے مراد کالی دیوی ہے۔ جس کی پوجا ہزاروں برسوں سے ہو رہی ہے۔ دِلّی میں اس دیوی کا مندر ۹ میل دور تغلق آباد کی طرف ہے۔ جوگ مایا کا مندر مہرولی میں ہے جہاں ہفتہ وار میلہ لگتا ہے۔ مہرولی ہی میں ساون میں پھول والوں کی سیر کے نام سے حضرت خواجہ قطب الدّین بختیار کاکی رحؒ کے مزار پر میلا لگتا تھا اور اب بھی لگتا ہے۔ ظاہر ہے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد جب مُغلیہ سلطنت کا نام و نشان مٹ گیا تو اس میلے کو شاہی سرپرستی حاصل نہ رہی۔ اس لیے یہ میلا اُس جوش سے جاری نہ رہا مگر اسے ہندوؤں نے سہارا دیا اور خواجہ صاحب کے مزار کے ساتھ انھوں نے اپنی توجّہ جوگ مایا کے مندر کی طرف مبذول کرلی چنانچہ سیّد احمد دہلوی (پھول والوں کی سیر، فرہنگِ آصفیہ جلد اوّل) لکھتے ہیں "غدر کے بعد سے اس میلے نے اور بھی ترقی کی یعنی خاصانِ ہنود کی طرف سے بُدھ کے روز جوگ مایا پر ایسے ہی دھوم دھڑّکے سے پنکھا چڑھنا شروع ہوگیا۔ سات سات اور نو نو پنکھے آگے پیچھے ہوتے ہیں ...." یہ قطعہ اسی عہد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس لیے اس کا زمانۂ فکر ۱۸۵۹ء کے قریب یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد کبھی ہو سکتا ہے۔

(۳)　ہم نشیں تارے ہیں، اور چاند شہاب الدین خاں
بزمِ شادی ہے فلک کاہکشاں ہے سہرا
ان کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو
ہے تو کشتی ہی، و لے بحرِ رواں ہے سہرا

یہ شعر مولانا مہرؔ نے اُس قلمی نسخۂ دیوانِ غالبؔ سے نقل کیے ہیں، جو بیگم مرزا شجاع الدّین

احمد خاں تاباں دہلوی کی ملکیت میں تھا۔ مالک رام صاحب نے لکھا ہے کہ انھوں نے بیاضِ علائی میں بھی انھیں دیکھا ہے۔ بہ ظاہر یہ اس پورے سہرے کے دو شعر ہیں جو مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب شاگردِ غالب (۱۸۴۰ء تا ۱۸۶۹ء) کی شادی پر کہا گیا۔ ثاقب کے سب سے بڑے صاحبزادے مرزا شجاع الدین احمد خاں تاباں ۲۳ دسمبر ۱۸۶۱ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے شادی مارچ ۱۸۶۱ء میں یا اس سے پہلے ہوئی ہوگی۔ غالب کے ایک خط مورخہ دوشنبہ ۸ فروری ۱۸۵۸ء بنام شہاب الدین ثاقب کے اس جملے "اپنے گھر میں اور اپنے بچوں کو میرے اور میرے گھر کی طرف سے دعا کہنا اور تم کو بھی تمہاری استانی دعا کہتی ہیں" سے شبہ ہوتا ہے کہ ثاقب کی شادی ۸ فروری ۱۸۵۸ء سے پہلے ہو چکی تھی۔ "اپنے بچوں" سے مراد البتہ علائی وغیرہ کے بچے ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو سہرے کا زمانۂ فکر بھی خط کی تاریخ ۸ فروری ۱۸۵۸ء کے پیشِ نظر ہی طے کرنا پڑے گا۔ شادی نواب شمس الدین احمد خاں والیِ فیروزپور جھرکا کی نواسی سکندر جہاں بیگم سے ہوئی تھی۔

(۴) آپ نے "مَسَّنِیَ الضُّرّ" کہا ہے تو سہی
یہ بھی، یا حضرتِ ایوب گِلا ہے تو سہی
رنج طاقت سے سوا ہو، تو نہ پیٹوں کیونکر؟
ذہن میں خوئے تسلیم و رضا ہے تو سہی
ہے غنیمت کہ بامّید گزر جائے گی عمر
نہ ملے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی
دوست گر کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری
نہ سہی لیک تمنّائے دوا ہے تو سہی
غیر سے دیکھیے، کیا خوب نباہی اُس نے
نہ سہی ہم سے پر اُس بُت میں وفا ہے تو سہی

نقل کرتا ہوں اُسے نامۂ اعمال ہیں، میں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
سبھی آجائے گی، کیوں کرتے ہو جلدی غالب
شہرۂ تیزیِ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

یہ غزل مولانا مہر نے "غالب" ص ۳۰۴ (طبعِ اوّل) میں دیوانِ غالب کے مخطوطۂ بیگم تاباں (حاشیہ ص ۱۰۷) سے نقل کی ہے۔ نیز یہ رسالہ 'آجکل' دہلی بابت ۱۵ جون ۱۹۴۳ء میں بھی شایع ہو چکی ہے۔

بقولِ مولانا مہر مرحوم، غزل، مخطوطۂ بیگم تاباں کے حاشیے پر درج تھی اور مخطوطۂ بیگم تاباں "بہ ظاہر رام پور والے قلمی نسخہ کی نقل معلوم ہوتا تھا۔" نسخۂ رام پور ۱۸۵۵ء میں لکھا گیا تھا، لہٰذا مخطوطۂ بیگم تاباں اُس کے بعد کتابت ہوا اور یہ غزل اُس کے بھی بعد حاشیے میں اضافہ کی گئی۔ 'ارمغانِ غالب' میں اسے ۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۱ء کی تصنیف کہا گیا ہے۔ مقطع سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ غزل ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد کہی گئی ہوگی۔

(۵) بُتو! توبہ کرو، تم کیا ہو؟ جب ادبار آتا ہے
تو یوسف ساحبیں بکنے سرِ بازار آتا ہے

یہ شعر مولوی احتشام الدین صاحب دہلوی کے مضمون (ماہ نو فروری ۱۹۵۰ء) سے نقل کیا گیا ہے۔ یہ مطلع انھیں ایک صاحب وجیہہ الدین خاں کی مملوکہ بیاض میں ملا تھا، اس بیاض میں مرزا صاحب کی غزل "کہا ہے تو سہی، رہا ہے تو سہی" بھی درج تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اس کے ساتھ کوئی دوسرا شعر نہیں ہے۔ وجیہہ الدین خاں نے غزلِ مذکورہ کے ہاتھ آنے کی حکایت یہ بیان کی ہے کہ ان کے والدِ ماجد مرحوم نے مرزا صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کے کلام کی اپنی بیاض میں لکھنے کے لیے استدعا کی۔ مرزا نے فرمایا کہ یہ غزل دیوان میں طبع ہونے سے رہ گئی ہے تم لے جاؤ۔ غالباً اسی کے ساتھ یہ مطلع بھی عنایت ہوا ہوگا کیونکہ اس بیاض میں غالب کے نام سے

درج ہے، کسی مطبوعہ دیوان میں نہیں پایا جاتا۔"

میں نے کہا ہے تو سہی، والی غزل کو بعد از ۱۸۵۷ء قیاس کیا ہے۔ لہٰذا غالب کے عنایت کردہ ایک ہی بیاض میں لکھے ہوئے اشعار کو اسی عہد میں شمار کرنا چاہیے۔ مگر میرا خیال ہے کہ غالب کم از کم اس بڑھاپے میں یعنی ۱۸۵۷ء کے بعد تو "سر بازار برائے فروخت آتا ہے" یا "سر بازار بکنے کے لیے آتا ہے"، کو "بکنے سر بازار آتا ہے" نہ کہتے۔ مطلع یقیناً ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کا ہے۔ اسے ابتدائی کلام یعنی ۱۸۱۶ء سے بھی پہلے کا قرار دینا چاہیے۔

غالب کے کچھ ہنگامی مصرعے اور شعر

۱ ؎ کاتی تھیں شمرو[1] کی بیگم، تن ناہایا ہو
دودھ میں بچے تھے شلغم، تن ناہایا ہو

مولوی احتشام الدین مرحوم نے اپنے مضمون 'غالب کے بعض غیر مطبوعہ اشعار اور لطیفے' (ماہ نو۔ فروری ۱۹۵۰ء) میں لکھا ہے کہ یہ "مطلع" مرزا کی ایک مہمل غزل کا ہے جو بچوں کے جھولے میں گانے کے لیے موزوں فرمائی تھی۔" اندازہ ہے کہ شعر ۱۸۶۵ء کے ابتدائی مہینوں میں کہا گیا ہوگا (دیکھیے خط نمبر ۱۱۲ بنام ہرگوپال تفتہ آخر مئی ۱۸۶۵ء)

۲ ؎ تم سلامت رہو قیامت تک
دولت و عزّ و جاہ، روز افزوں

اس شعر کا پہلا مصرع مرزا نے نواب یوسف علی خاں ناظم کے نام کے

---

[1] زیب النساء عرف بیگم شمرو ۱۷۹۶ء (تذکرہ ماہ و سال۔ ۱۷۵۱ء) تا ۲۷ جنوری ۱۸۳۶ء

خط مورخہ ۱۵ فروری ۱۸۵۷ء میں اور پورا شعر انھیں کے نام کے خط مورخہ ۱۴ اگست ۱۸۶۳ء میں لکھّا ہے۔

۳ ؎ دِرَم و دام اپنے پاس کہاں
چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

آبِ حیات میں درج ہے کہ حسین علی خاں (عارف کا چھوٹا لڑکا) ایک دن کھیلتا کھیلتا آیا کہ دادا جان (غالب) مٹھائی منگادو۔ آپ نے فرمایا کہ پیسے نہیں۔ وہ صندوقچہ کھول کر ادھر ادھر ٹٹولنے لگا اور آپ نے یہ شعر فرمایا۔

حسین علی خاں (شادؔاں) کا سالِ ولادت ۱۸۵۰ء ہے۔ اندازہ ہے اس واقعے کے وقت (آغاز ۱۸۵۷ء) وہ سات آٹھ برس کا ہوگا۔

۴ ؎ سات جِلدوں کا پارسل پہنچا
واہ کیا خوب برمحل پہنچا

یہ شعر میرزا حاتم علی مہرؔ کے نام کے خط مورخہ ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء میں درج ہے۔

۵ ؎ یہ خبط نہیں تو اور کیا ہے

"برہانِ قاطع کا وہ نسخہ جس کے حاشیوں پر ابتداً مرزا صاحب نے اپنے اختلافی نوٹ لکھے اور جو بعد کو قاطع برہان کے نام سے مرتّب ہو کر چھپے ..... لفظ 'خسک' پر حاشیہ لکھتے ہوئے یہ مصرع بھی مرزا صاحب کے قلم سے نکل گیا ہے۔" ظاہر ہے کہ یہ ۱۸۵۸ء ہی میں لکھّا گیا ہوگا۔

۶ ؎ روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

غالب نے یہ شعر اپنے خط بنام مجروح مورخہ ۲ فروری ۱۸۵۹ء میں لکھّا ہے۔

۷ ؎ دیکھیے کیا جواب آتا ہے

مندرجۂ خط بنام مجروح ۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء۔ یہ پورے جملے کا ایک ٹکڑا ہے جو

از خود موزوں ہو گیا ہے: "میں نے اس کا اپیل لفٹننٹ گورنر کے یہاں کیا ہے، دیکھیے کیا جواب آتا ہے۔"

۸ ؎ خدا سے میں بھی چاہوں از رہِ مہر
"فروغِ میرزا حاتم علی مہر"

مندرجۂ خط بنام مہر۔ اپریل ۱۸۵۹ء۔ اس شعر کا دوسرا مصرع خود مہر کا ہے جو ان کی مثنوی 'شعاعِ مہر' میں درج ہے۔

۹ ؎ پیر و مرشد معاف کیجے گا
میں نے جمنا کا کچھ نہ لکھّا حال

مندرجۂ خط بنام نواب انور الدّولہ بہادر شفقؔ۔ ۱۹ جولائی ۱۸۶۰ء۔ عُودِ ہندی میں یہ اسی طرح درج ہے مگر اُردوے معلّٰی میں اسے نثر کی شکل دے دی گئی ہے اگرچہ اسے منظوم بھی پڑھا جا سکتا ہے ؎

پیر و مرشد معاف کیجے گا ؛ میں نے جمنا کا حال کچھ نہ لکھا

۱۰ ؎ خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام
یہی ہے مذہبِ حق، والسّلام والاکرام

مندرجۂ خط بنام مجروح۔ مئی ۱۸۶۱ء

۱۱ ؎ تھا تو خط پر نہ تھا جواب طلب
کوئی اس کا جواب کیا لکھتا

یہ شعر چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام کے خط میں لکھّا ہے۔ خط پر تاریخ درج نہیں مگر قرائن سے پتا چلتا ہے کہ ۱۸۶۲ء کا لکھّا ہوا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے 'غالب کے خطوط'، جلد دوم ص ۶۱۱۔

۱۲ ؎ میں بھولا نہیں تجھ کو، اے میری جاں
کروں کیا، کہ یاں گر رہے ہیں مکاں

مندرجۂ خط بنامِ مجروح مورخہ ۲۶ ستمبر ۱۸۶۲ء ۔

۱۳ ؎ جویاے حالِ دہلی و آلورِ سلام لو

یہ مصرع خط مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۸۶۲ء بنامِ مجروح، کا سرنامہ ہے ۔

۱۴ ؎ ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک

عنایاتِ الٰہی ہو مبارک

مندرجۂ خط بنامِ علائی ۔ اپریل، مئی ۱۸۶۳ء ۔ (غالب کے خطوط حصّہ اوّل ص ۳۰۲)۔

۱۵ ؎ معلوم ہوا خیر کہ ٹھینگا باجا

مندرجۂ خط بنامِ علائی ۱۸ مئی ۱۸۶۴ء

۱۶ ؎ کوئی اس کا جواب دو صاحب

سائلوں کا ثواب لو صاحب

مندرجۂ لطائفِ غیبی مطبوعہ ۱۸۶۴ء ص ۲۲۔ اب یہ عام طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے کہ لطائفِ غیبی، سیاح کی نہیں بلکہ خود مرزا کی تصنیف ہے ۔

۱۷ ؎ خوشنودیِ احباب کا طالب غالب

ظاہر ہے کہ یہ مصرع خط کے خاتمے کے الفاظ پر مبنی ہے ۔ صحیح سالِ تحریر کا علم نہیں مگر یہ ایک خط بنامِ قدر بلگرامی کے آخر میں (تاریخ درج نہیں صرف دن اور وقت لکھا ہے "چہار شنبہ بارہ پر تین بجے") اور مثنوی "شعاعِ مہر" کی تقریظ کو تمام کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

۱۸ ؎ کھانا نہ انھیں کہ یہ پرائے ہیں آم

یہ غالب کی ایک رباعی کا چوتھا مصرع ہے جو جلوۂ 'خضر' میں درج ہے ۔ اس کے تین مصرعے صفیر بلگرامی کو یاد نہیں رہے ۔ صفیر ۱۸۶۵ء میں غالب سے ملنے دلی آئے تھے ۔ تفصیل کے لیے دیکھیے دیوانِ غالب نسخۂ عرشی طبع دوّم ص ۱۴۱ ۔

۱۹ ؎ میں قائلِ خدا و نبی و امام ہوں

بندہ خدا کا اور علی کا غلام ہوں

مندرجۂ خط بنامِ صفیر بلگرامی مورخہ ۳ مئی ۱۸۶۵ء

۲۰ ؎ ہاتفِ غیب سن کے یہ چیخا

ان کی تاریخ میرا تاریخا

جناب احسن مارہروی مرحوم نے اپنی کتاب مکاتیب الغالب (ص ۳۵) پر لکھا ہے ۔

"راقم الحروف (احسن مارہروی) کے پردادا شاہ سید عالم صاحب (صاحب عالم مارہروی ۔ ولادت ۶ ربیع الثانی ۱۲۱۱ھ مطابق ۸ اکتوبر ۱۷۹۶ء) سے مرزا کی اکثر خط و کتابت رہتی تھی ۔ ایک مرتبہ حضرت صاحب نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ آپ کی ولادت کس سنہ میں ہوئی اور یہ بھی اطلاع دی کہ میری ولادت لفظ 'تاریخ' سے نکلتی ہے جس کے عدد ۱۲۱۱ ہوتے ہیں ۔ مرزا نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا ، ہاتفِ غیب الخ ۔ ـــــــــ"

جناب صاحب عالم مارہروی، جن کی مرزا بہت عزت کرتے تھے، مرزا سے ایک سال پہلے پیدا ہوئے اور تین سال بعد فوت ہوئے یعنی اُن کی وفات ۲ محرم ۱۲۸۸ھ (۲۴ مارچ ۱۸۷۱ء) کو ہوئی ۔ صاحبِ عالم، ان کے صاحبزادے شاہ عالم اور عبدالغفور سرور (جن کے خطوں میں صاحبِ عالم مارہروی کے کئی خط شامل ہیں) کے نام کے خطوط جو آج تک دستیاب ہوئے ہیں، وہ ۱۸۵۸ء سے ۱۸۶۶ء تک کے عرصے میں لکھے گئے ہیں ۔ یہ شعر ان خطوں میں درج نہیں ۔ ہو سکتا ہے اُنھی دنوں میں کبھی لکھا گیا ہو مگر خط محفوظ نہ رہا ہو ۔ اس لیے اس شعر کو ۱۸۵۸ء کے بعد اور ۱۸۶۶ء سے پہلے کا کہا ہوا ہی کہا جا سکتا ہے ۔

۲۱ ؎ تحریر ہے یہ غالبِ یزداں پرست کی

تاریخ اس کی آج نویں ہے اگست کی

مندرجۂ خمخانۂ جاوید جلد اوّل ص ۸۲ ۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر کا زمانۂ فکر

۱۸۶۶ء کے لگ بھگ ہوگا۔

۲۲ ؎ سنین عمر کے ستر ہوئے شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

غالب کا سالِ ولادت ۱۷۹۷ء ہے۔ اس طرح یہ شعر ۱۸۶۷ء میں کہا گیا ہوگا۔ ہجری حساب سے ستر برس ۱۲۸۲ھ (۶۶-۱۸۶۵ء) میں پڑیں گے۔

۲۳ ؎ آج یک شنبے کا دن ہے آؤ گے؟
یا فقط رستا ہمیں بتلاؤ گے

خمخانۂ جاوید جلد اوّل ص ۸۱ میں لالہ سری رام نے لکھا ہے کہ پیارے لال آشوب دہلی میں ہوتے تھے تو کوئی ہفتہ مرزا صاحب کی ملاقات سے خالی نہ جاتا تھا۔ دیر ہو جاتی تو مرزا ایک نہ ایک شعر لکھ کر آشوب کے پاس بھیج دیتے "جس کا مضمون حسنِ طلب ہوتا"۔ ان میں سے ایک شعر یہ ہے۔ غالب نے دسمبر ۱۸۶۷ء کو ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ دائر کیا تھا اس مقدمے میں پیارے لال آشوب (جو ابھی ۳۶ سال کے بھی نہ تھے) گواہوں میں سے ایک تھے۔ شاید یہ شعر انھی دنوں کا ہو۔

مندرجۂ بالا اشعار کی کوئی ادبی حیثیت نہیں۔ یہ غالب کی شوخیِ طبع اور حاضر دماغی کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی قدر و قیمت اس پر منحصر ہے کہ یہ غالب کے کہے ہوئے ہیں۔ اور یہ کسی نہ کسی واقعے کی نشان دہی میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

دیوانِ غالب

طبعِ اوّل

غالب، میجر جان جاکوب بہادر (جان جیکب) کو، مطبع سیّد الاخبار کے بارے میں کچھ اطلاعات بہم پہنچاتے ہوئے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

"..... دیوانِ ریختہ کہ ورنا تمامی تمام است، عجب نیست کہ ہم دریں ماہ بہ تمامی و آنگاہ بنظرگاہِ سامی رسد ....."

(ترجمہ: (میرا) دیوانِ اردو بھی جو باوجود ادھورا ہونے کے، مکمل ہے، عجب نہیں اسی مہینے میں (اسی مطبع سے) تمام ہو کر آپ کی نگاہِ عالی سے گزرے .....)

اس خط سے دو باتیں سامنے آتی ہیں: اوّل یہ کہ دیوان چھپ رہا ہے۔ دوم یہ کہ دیوان اگرچہ ادھورا ہے تاہم مکمل ہے یعنی منتخب ہے۔ سرورق کے مطابق، بالآخر دیوان شعبان ۱۲۵۷ھ مطابق اکتوبر ۱۸۴۱ء میں چھپ گیا۔ دیوان کے ص ۱۰۴ پر ایک رباعی درج

---

۱ پنج آہنگ، طبع اوّل ۱۸۴۹ء، ص ۳۸۸